پیراہنِ شرر

«ایک خواب اور» پر نہرو ادبی انعام

۱۵ نومبر ۱۹۶۵ء

پیراہنِ شرر

نئی نظمیں

سردار جعفری

حلقۂ ادب ۔ بمبئی ۲۶
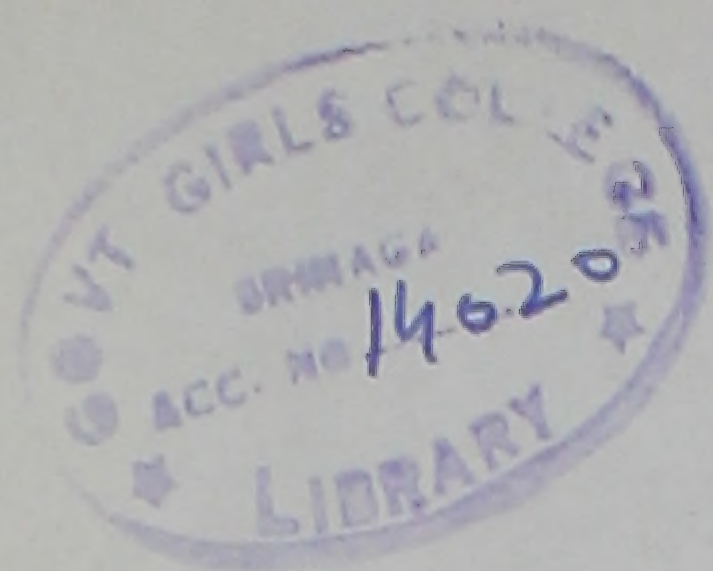
اُن کا جو فرض ہے وہ اہلِ سیاست جانیں
میرا پیغام محبّت ہے جہاں تک پہنچے

جگرؔ مرادآبادی

مَیں اپنے دوست مشہور مصوّر حسین کا شکر گزار ہوں
جنھوں نے گرد پوش کا ڈیزائن بنایا ہے

فہرست

پیراہنِ شبنم

علی سردار جعفری کو میں اندازاً ۲۷ یا ۲۸ سال سے جانتا ہوں۔ یہ اُس زمانے میں لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم تھے اور انجمن ترقّی پسند مُصنّفین کی لکھنؤ کی شاخ کے سرگرم رُکن۔ میرا حافظہ اگر غلطی نہیں کرتا تو وہ شاید اس ادبی انجمن کے سکریٹری تھے۔ اس انجمن کے جلسے مرحومہ رشید جہاں کے مکان پر ہوتے تھے اور گو اُس زمانے میں بھی یہ شعر کہتے تھے لیکن اُس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ایک پُرجوش باحوصلہ اور باعمل اشتراکیت پر ایمان لانے والے نوجوان کارکن زیادہ ہیں اور شاعر کم۔ اراکین انجمن ترقّی پسند مصنّفین کے امیرِ کارواں اُس وقت بظاہر تو جوشؔ ملیح آبادی تھے لیکن اُن کے محبوب ترین شاعر دراصل مجازؔ مرحوم تھے اور اُس کے بعد جذبیؔ اور جاں نثار اخترؔ کا نام آتا تھا۔ کسے خبر تھی کہ چند ہی سال بعد سردار ان سب کو پیچھے چھوڑ کر آگے نکل جائے گا اور دُنیائے شعر میں اپنا مخصوص اور بلند مقام خالی اپنے

وطن ہی میں حاصل نہ کرے گا بلکہ اُس کی شاعرانہ عظمت اپنے ملک کے باہر بھی تسلیم کی جائے گی۔

سردار مجھ سے عمر میں ۱۲ یا ۱۳ سال چھوٹے ہیں۔ اگر زندگی میں جمود نہ ہو تو یہ عرصہ ادبی قدروں کو بدل دینے کے لیے بہت کافی ہے۔ موجودہ دَور تو اتنا برق رفتار ہو چکا ہے کہ صبح کا مستقبل شام آتے آتے ماضی بن چکا ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سردار کی شاعری کا میرے دَور کی شاعری سے موضوعاتِ سخن، اندازِ بیان، علامات اور تخلیقِ حسن کے نظریات، چاروں اعتبار سے مختلف ہونا ناگزیر تھا۔ ایک سردار کیا آج کے دَور کے سب شاعر اپنے اپنے انداز میں نئے تخلیقی تجربے کر رہے ہیں اور جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ شاعری کچّی ہے اور انحطاطِ ادب کی دلیل ہے وہ بڑی حد تک اپنی پرانی مٹتی ہوئی قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور بدلتی ہوئی زندگی کی زندہ قدریں قبول کرنے کو راضی نہیں۔

موجودہ دَور کے شعرا کی طرف جب بھی میرا خیال جاتا ہے تو میرے ذہن میں پہلا نام سردار ہی کا آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ میری پسند کی بات ہے۔ شاید اس پسند کی وجہ یہ ہے کہ سردار کی اور میری محض ادبی قدریں ہی نہیں بلکہ انسانی قدریں بھی بہت کچھ مشترک ہیں اور گو آج وہ دھارے پر ہے اور میں کنارے سے لگ چکا ہوں لیکن پھر بھی ہماری نظریں ایک ہی اُفق کی طرف

اُٹھتی ہیں۔ ہم نے ایک ہی خواب دیکھا ہے اور اپنی بساط بھر اسی طرف اپنی کشتیاں بڑھا کر اوروں کو بھی اس خواب کو حقیقت بنانے کی دعوت دی ہے۔

آج زندگی کا ہر فن کار سے خالی یہی تقاضا نہیں ہے کہ وہ زندگی کی ناانصافیوں اور غلط نظریوں کی وجہ سے جو انسانی مشکلیں اور محرومیاں ہیں اُن کو سمجھے بلکہ اُن کے خلاف آواز بھی اُٹھائے اور جہد بھی کرے۔ صحیح مفہوم میں آج کے شاعر کو مجاہد بھی ہونا ضروری ہے لیکن شاعر کا جہد میدانِ جنگ میں نہیں ہوتا۔ ہوسکتا ہے کہ ایک شاعر تلوار بھی اٹھالے لیکن یہ فعل اُس کا بہ حیثیت ایک شہری کے ہوگا بہ حیثیت ایک فن کار کے نہیں کیوں کہ اصل لڑائی تو دِلوں اور ذہنوں میں لڑی جارہی ہے۔ اور تلوار اس نزاع میں کام نہیں دیتی۔ سردار کی زندگی میں ایک مقام ایسا آیا تھا جب مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں سردار کے دل میں جو شہری ہے وہ شاعر کے ہاتھ سے قلم چھین کر تلوار نہ اُٹھالے لیکن شکر ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی اور سردار نے قلم ہی کو تلوار بنالیا۔ سردار کے ارتقائے فن میں یہ ایک اہم منزل تھی اور اس مقام سے گزرنے کے بعد اس کا شعور، جو پہلے ہی سے بیدار تھا اور زیادہ پختہ ہوا اور اُس کے لہجے میں تندی کی جگہ وہ نرمی آگئی جس نے اُسے ساری نوعِ انساں کے قریب کردیا۔ "پیراہنِ شرر" تک پہنچتے پہنچتے یہ قلم کی تلوار اب اُس کے ہاتھ میں "شاخِ گُل" بن چکی ہے اور وہ نظریاتی غبار کی سطح سے اُبھر کر کُرۂ نور پر پہنچ گیا ہے۔ اب اُس کے پیام میں ایک پیمبرانہ حلاوت ہے اور

اس کی نظر میں زخمِ انساں کے لیے مرہم۔ آج اُس کی منزل کا تعین اس مجموعے کا آخری شعر کرتا ہے

کم ظرفیِ گفتار ہے دُشنام طرازی　　　　تہذیب تو شائستگیِ دیدۂ تر ہے

حرفِ اوّل میں وہ اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سماجی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت خود بخود بدل جاتی ہے۔ بدی ختم ہو جاتی ہے اور نیکی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے مفر نہیں کہ سماجی نظام کی تبدیلی جو ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی ناکافی ہے۔۔۔۔۔۔۔ معاشی اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا برحق ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خود غرضی، غلط احساسِ برتری اور اسی قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دُنیا سے جنگوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔"

جب سے انسان نے متمدّن زندگی میں قدم رکھا ہے وہ امن کا جویا رہا ہے لیکن ابھی تک اُس کی قسمت میں ایک کے بعد دوسری جنگ آتی چلی گئی ہے۔ انسان کا بڑھتا ہوا علم ہر آنے والی جنگ کو جنگِ گزشتہ سے اور زیادہ ہولناک اور تباہ کُن بناتا چلا جا رہا ہے اور آج یہ نوبت آ گئی ہے کہ نوعِ انساں کے مرنے جینے ہی کا سوال سامنے آ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے انسان کی عقل (جو اس کی ذاتی

غرض اور حرص کا دوسرا نام ہو کر رہ گئی ہے) اُس کے دل (جو جذبۂ اخوّت کا دوسرا نام ہے) کو پیچھے چھوڑ کر اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ اب وہ اُس کی آواز بھی نہیں سُن سکتی۔
آج دُنیا کو تباہی سے بچانا دراصل صرف اس سوال پر منحصر ہے ؎

نمو کی طاقت ابھی دلوں میں ہے یا اسے زیست کھو چکی ہے
ضمیرِ انساں میں آنچ باقی ہے یا یہ لَو سرد ہو چکی ہے

آج ہر فن کار کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ عقل اور دل کا یہ فاصلہ اور بڑھنے نہ دے بلکہ انھیں قریب لانے کی کوشش کرے اور ضمیرِ انساں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر اس انسانی اخوّت کی لَو کو بُجھنے نہ دے بلکہ ہَوا دے دے کر اسے شعلۂ جوّالہ بنا دے۔

اگر اس نظر سے اردو شعری ادب کا جائزہ لیا جائے تو سردار کا مقام سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ "پیراہنِ شرر" کی زیادہ تر نظمیں نوعِ انساں کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ سردار کا بیدار شعور اور ساتھ ہی ساتھ الفاظ کا فن کارانہ حُسنِ انتخاب ان نظموں کو ادبی شہکار بنا دیتا ہے اور اس کے احساس کی صداقت اور خلوص اس کے لہجے کو وہ دردمندی بھی عطا کر دیتا ہے جو بعض نظموں کو انسانی دستاویز کا درجہ دے دیتا ہے۔ ان نظموں میں سردار ایک معلّم اور فلسفی بن کر نہیں بلکہ ایک دوست بن کر سامنے آتا ہے اور چونکہ وہ غمِ مشترک میں اپنا ساتھی ہے لہٰذا اس کی آواز میں ایک بے پناہ کشش اور اُس کے پیام میں ایک پائندہ اثر پیدا ہو جاتا ہے۔ ظریف مرحوم نے شاعر کے بارے میں کہا تھا ؎

تو معالج نفسِ امّارہ کی بیماری کا ہے　　　　تو ذریعہ قوم اور ملّت کی بیداری کا ہے

میں نے بھی اپنے مجموعۂ کلام "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" میں ایک عظیم فن کار کی تعریف یوں کی تھی۔

"میں تو اُس فن کار کو عظیم فن کار سمجھتا ہوں جو نوعِ انساں کی اکائی بن کر انسانی دردو غم سہے اور اس غم کا مکمل احساس ہونے کے باوجود اس کی ذات میں اتنی لوچ اور اس کے فن میں اتنی سکت ہو کہ وہ اس زہر کو امرت بنا کر پی جائے، اپنے دل و دماغ کی معصومیت، تازگی اور حُسن کو برقرار رکھے اور پھر دانائی کی چوٹیوں سے کُل نوعِ انساں کو جس میں گمراہ انسان بھی شامل ہوں، ایک طفلِ معصوم کے میٹھے اور سُریلے بولوں میں پُکارے اور منزلِ انسانیت کی طرف قدم بڑھانے کا پیغام دے۔"

"پیراہنِ شرر" کی اِن نظموں میں سردار نے اگر یہ مقام حاصل نہیں کر لیا ہے تو اس مقام سے بہت دُور بھی نہیں ہے۔

زندگی اور ادب دونوں ایک سلسلۂ لامتناہی ہیں۔ دونوں اُفق در اُفق آگے بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں اور جب تک دُنیا قائم ہے یہ سلسلہ ختم ہونے والا نہیں۔ میرا خیال تو ایسا ہے کہ وہ نظامِ حیات کبھی بھی مرتب نہ ہو سکے گا جس سے خوب تر کا جلوہ کچھ نگاہوں میں نہ ہو۔ یہ خوب تر کی خواہش ہی ارتقائے زندگی کا راز ہے۔ عظیم فن کار وہی ہے جس کا دیدۂ بینا اس خوب تر کو دیکھ سکے اور کاروانِ انسان کو اس خوب تر منزل کی طرف گامزن ہونے پر آمادہ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنے میں دُشواریوں کا

سامنا کرنا پڑتا ہے اور سختیاں اُٹھانی پڑتی ہیں۔ لیکن ایک سچّا شاعر ان سے ڈر کر اپنی آواز اُٹھانے سے گریز نہیں کرتا۔ غالبؔ کے اِس شعر میں ؎

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اور چکبستؔ کے اِس شعر میں ؎

نظر کو بند کریں یا مجھے اسیر کریں مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

اور فیضؔ کے اِس قطعے میں ؎

متاعِ لوح و قلم چھِن گئی تو غم کیا ہے کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھ دی ہے ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

اور سردارؔ کے "پیراہنِ شرر" کے اِن اشعار میں ؎

کھڑا ہے کون یہ "پیراہنِ شرر" پہنے
بدن ہے چور، تو ماتھے سے خون جاری ہے
کوئی دِوانہ ہی لیتا ہی مسیح کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک

باوجود "اندازِ بیان" اور علامات کے نمایاں فرق کے ایک حیرت انگیز خاندانی مشابہت ہے۔ ایک کرب جو دَور بہ دَور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے لیکن سردارؔ کی آواز یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کی نگاہِ بینا ایک درخشاں مستقبل کی بشارت بھی دیتی رہے۔ اِس مجموعے کی آخری نظم "امانتِ غم" میں سردارؔ کہتا ہے ؎

امانتِ غمِ انساں امانتِ غمِ دِل
یہ اِک چراغ ہے قندیلِ مہر و مہ کی طرح
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو

- - - - - - - - - - - - -

اُٹھو کہ جشنِ دل و جاں منایا جائے گا
ہر اِک چمن میں یہی گُل کھلایا جائے گا
یہ گُل جو دردِ محبّت امانتِ غم ہے
یہ گُل جو شوخ بھی خوں گشتہ بھی ملول بھی ہے
خدائے عشق بھی ہر امن کا رسول بھی ہے

انسان کے دل کی آرزو ناموافق ماحول سے لڑنے کے لیے ایک شاعر کا پیام بن کر ہمیشہ ہونٹوں تک آتی رہی ہے۔ غالب کے کاغذی پیرہن سے لے کر سردار کے پیراہنِ شرر تک یہ آرزو نہ جانے کتنے لباس پہن کر گھڑی گھڑی سامنے آئی ہے لیکن جو چیز "پیراہنِ شرر" کو طرّۂ امتیاز بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ اس پیراہنِ شرر کے نیچے ایک پیراہنِ شبنم بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اس سلگتی ہوئی دُنیا کو یہ پیراہنِ شبنم ابھی سالوں میسّر نہ ہو لیکن ایک سچے فن کار کا حوصلہ اس خیال سے پست نہیں ہوتا۔ وہ تو اس عقیدے پر عمل کرتا ہے ؎

فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم
بَلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

آنند نرائن مُلّاؔ ۔ ۲۵ فروری ۶۶ء

حرفِ اوّل

ایک دیوانہ کھڑا ہوا ہے، چاک دامن، چاک گریباں۔ اور اس پر چاروں طرف سے پتھراؤ ہو رہا ہے۔ یہ بارش اتنی شدید ہے کہ پتھّر سے پتھر ٹکرا رہا ہے اور جسم سے خون کی دھاریں نکل رہی ہیں اور پتّھروں سے چنگاریاں اُڑ رہی ہیں اور اس طرح برس رہی ہیں کہ دیوانے کے برہنہ جسم کا لباس بن گئی ہیں۔ اب چاکِ دامن اور چاکِ گریباں کی بھی گنجائش نہیں رہ گئی ہے مگر دیوانہ جو خود صداقت ہے اور صداقت کی آواز، سر سے پاؤں تک ایک حسین مگر خون آلود شعر بن گیا ہے ؎

بر جرم عشق توام می کشند غوغائیست

تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشائیست

یہ قتل صدیوں سے جاری ہے اور نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔ یہ رُکتا ہے اور پھر شروع ہو جاتا ہے اور انسانیت ایک منزل اور آگے بڑھ جاتی ہے۔ کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ صداقت، جیسے گلاب کا پودا ہے،

جس کی شاخیں قلم ہو جانے کے بعد نئے پھولوں کا پیراہن پہن لیتی ہیں۔ یہ بھی پیراہنِ شرر ہے۔ یا صداقت ایک دانہ ہے جو زمین میں دفن ہونے کے بعد پھر اُگتا ہے اور ہزار دانوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ مسیح بھی ہے اور حُسین بھی اور انسان کی لافانی جدوجہد بھی۔ یہ کذب کی قاتلانہ حرکتوں کا جواز نہیں ہے بلکہ صداقت کی مظلومیت کا کرشمہ ہے جو ظلم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ اس کی زبان کبھی بند نہیں کی جا سکتی، اس کی خوش بو کبھی قید نہیں کی جا سکتی ؎

دستِ صیّاد بھی عاجز ہے، کفِ گل چیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ سماجی نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت خود بخود بدل جاتی ہے، بدی ختم ہو جاتی ہے اور نیکی کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اعتراف سے مفر نہیں کہ سماجی نظام کی تبدیلی، جو ضروری بھی ہے اور ناگزیر بھی، ناکافی ہے۔ ذہنی اور روحانی تبدیلی بھی ایک جہاد ہے اور چونکہ یہ جہادِ نفس ہے اس لیے اور بھی مشکل ہے۔ کبیر داس کے الفاظ ہیں :-

"جسم و جان کے رَن میں گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے۔
ہوس، غصّہ، غرور اور لالچ مقابلے پر کھڑے ہوئے ہیں۔

صبر، قناعت اور صداقت کی بادشاہت میں شمشیر کا نام
بلند ہو رہا ہے۔۔۔۔

"صداقت کے متلاشی کی جد و جہد بہت دشوار ہے۔
سورما کی لڑائی دو چار گھنٹے چلتی ہے ستی کی جد و جہد
ایک پل میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن صداقت کا متلاشی دن رات
جنگ کرتا ہے۔ اس کی لڑائی زندگی کے آخری لمحے تک
جاری رہتی ہے۔"

بہتر سماجی نظام اس جہادِ نفس کے لیے سازگار فضا پیدا کرتا ہے۔
لیکن اِس سازگار فضا میں بھی مسلسل جہاد ضروری ہے۔ یہ اجتماعی عمل بھی
ہے اور انفرادی بھی۔

دوسروں کے نفس سے پہلے اپنے نفس سے جہاد ضروری ہے معاشی
اور سیاسی نظاموں کی ناانصافیوں کو پہچاننا اور ان کے خاتمے کے لیے لڑنا
برحق ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ صدیوں کی نفرت، ہوس، بدی، خود غرضی،
غلط احساسِ برتری اور اس قسم کے دوسرے تاریک جالوں سے دل و
دماغ کی صفائی بھی برحق ہے۔ اس کے بغیر نہ تو دنیا سے جنگوں کا خاتمہ
ہو سکتا ہے اور نہ ناانصافیاں ختم ہو سکتی ہیں۔

"تلوار پرانے ظالموں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود تو ضرور کر سکتی ہے

لیکن نئے ظالموں کو پیدا کرنے والی کوکھ کو ضبطِ تولید نہیں سکھا سکتی۔ پھر کتنی بار تاریخ کی نہ بند ہونے والی آنکھوں نے یہ تماشا دیکھا ہے کہ مظلوم ظالموں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ اس بھیانک قلبِ ماہیت کو بھی تو روکنا ضروری ہے۔

خارجی نظام کی تبدیلی کی جدوجہد سیاسی جماعتوں کا اجتماعی عمل ہے۔ لیکن انسانی روح کے داخلی نظام کی ترتیب و تربیت کی جدوجہد شاعروں اور دانشوروں کے حصے میں آتی ہے۔ اس میں شعر و فن کی تمام اصناف کام آتی ہیں۔ عشقیہ شاعری روح میں لطافت پیدا کرتی ہے اور لذتِ فراق کو بھی لذتِ وصال بنا کر انسانوں کو سخت سے سخت حالات میں جینا سکھاتی ہے اور سیاسی اور انقلابی شاعری روح کو صلابت عطا کرتی ہے۔ ضرورت دونوں کی ہے۔ اخلاقی شاعری کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن شاعر کا منصب واعظ کے منصب سے بلند ہے اور اندازِ بیان مختلف۔ یہی وجہ ہے کہ ممبر پر واعظ جلوہ گر ہوتا ہے لیکن دلوں میں شاعر ابھرتا ہے۔

میری یہ نئی نظمیں جو پیراہنِ شرر پہنے کھڑی ہیں، سیاسی دستاویزیں نہیں ہیں۔ واقعات ان کی تخلیق میں کارفرما ضرور رہے ہیں۔ لیکن یہ واقعات کا بیان نہیں ہیں بلکہ ان سے پیدا ہونے والے روحانی کرب کا اظہار ہیں۔ انھیں احتجاج کہنا بھی غلط ہے۔ شاید دل کی چیخ اور روح کی پکار نے ان نظموں کی شکل اختیار کر لی ہے۔

کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے۔ جیسے دُنیا کے سر پر خوف اور نفرت کے دو بھوت منڈلا رہے ہیں (اور یہی انسان کے سب سے بڑے دشمن ہیں) جن سے گھبرا کر انسانی عقل ماؤف ہو جاتی ہے اور دل کی شرافت کمتر درجے کے جذبات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اِن بھوتوں سے لڑنے کے بجائے انسان انسانوں کا خون کرنے لگتے ہیں اور خون جتنا زیادہ بہتا ہے خوف اور نفرت میں اُتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور شاعر کی آواز گونگی ہو جاتی ہے اور ساز کے تار ٹوٹ جاتے ہیں ؎

گیت کے دل میں خنجر ہے، الفاظ ہیں سر بریدہ

اپنے قبضے میں اِک بے بسی کے سوا کچھ نہیں
نالے بے کار، فریاد بے سود ہے
آؤ مل کر محبّت کو آواز دیں
نیکیوں کو پُکاریں

یہ آواز اور یہ پکار خوف اور نفرت کے گھرے اندھیرے میں کتنی ہی نحیف و نزار، کتنی ہی بے کار کیوں نہ معلوم ہو لیکن اِس میں امید کی ایک ننھّی سی کرن دکھائی دیتی ہے جو گھنے سے گھنے اندھیرے کے دل میں اُتر سکتی ہے اور خوف زدہ روح کو ایک لمحے کے لیے بے خوف بنا سکتی ہے ؎

اِس اندھیرے میں کہ ملتی نہیں انسان کو راہ

صرف تابندہ ہے شاعر کی نوائے ساقی

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے کے بعد سے، جنگ نہ کرنے کے عہد اور انجمن اقوامِ متحدہ کی تشکیل کے باوجود، دُنیا تیسری جنگِ عظیم کے خطرے سے دو چار ہے اور اگر یہ جنگ ہوگئی تو آخری جنگ ہوگی۔ لیکن اتفاق سے وہ خوف جو جنگوں کو جنم دیتا ہے اُسی خوف نے تیسری عالم گیر جنگ کو روک بھی رکھا ہے۔ خوف ناک ایٹمی اور ریڈیائی ہتھیاروں سے مسلّح طاقتوں کے درمیان ایک باہمی توازن قائم ہوگیا ہے۔ لیکن جب کبھی دنیا کے کسی گوشے میں کوئی چھوٹی سی جنگ شروع ہوتی ہے تو اس توازن کے بگڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اور تیسری عالمگیر جنگ کا بھیانک چہرہ دکھائی دینے لگتا ہے۔

گزشتہ چند سالوں کے اندر تیسری جنگِ عظیم کا محور یورپ سے ایشیاء میں منتقل ہوگیا ہے کیوں کہ ایشیاء اور افریقہ کے آزاد ہونے والے ملک جو کل تک غلام تھے دنیا کی بڑی طاقتوں کے توازن میں فرق پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اب ویت نام سے کشمیر تک ایک نیم دائرہ ہے جو ہمالیہ کی چوٹیوں سے گزرتا ہوا جہلم کی وادیوں تک پہنچ جاتا ہے اور اس میں ایشیائی اقوام کی آرزوؤں اور امیدوں کے ساتھ دنیا کی بڑی طاقتوں کے مفادات اور سیاسی مصلحتوں کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔

اِس نیم دائرے کے بطن میں مستقبل کی ساری تعبیریں ہیں۔ وہ بہت بھیانک بھی ہو سکتی ہیں اور اگر انسانی اقدار کی جیت ہو تو ایک خوبصورت بشارت بھی بن سکتی ہیں لیکن یہ بشارت اُس دن پوری ہو گی جب خوف کے بجائے محبّت جنگوں کے روکنے کا باعث بنے گی۔ جب نفرت کے بجائے ایک عالمگیر انسانی برادری کا تصوّر انسانوں کے درمیان نئے رشتے قائم کرے گا۔

اِس لیے آج کی جنگ آلود فضا میں ان قدروں کا نام بار بار لینا ضروری ہے جو ساری انسانیت کا صدیوں کا ورثہ ہے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ ہندوستان نے اپنی بائیس دن کی دفاعی جنگ میں بھی جو ہمیں مجبوراً لڑنی پڑی ان قدروں کو فراموش نہیں کیا۔ ہم جو گوتم بُدھ، اشوک، کبیر، گُرو نانک، میرؔ، غالبؔ، ٹیگورؔ، گاندھی اور نہرو کی شرافت کے وارث ہیں آج بھی ان الفاظ کو فخر کے ساتھ دُہرا سکتے ہیں جو ہمارے راشٹرپتی ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ۲۵ ستمبر ۶۵ء کی رات ہندوستانی قوم کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی ریڈیو تقریر میں ارشاد فرمائے تھے:۔

"جنگ جو کبھی کبھی دفاعی مقاصد کے لیے ضروری ہو جاتی ہے اس کے بعد بھی ایک بدی ہے اور انسانیت کے لیے خطرہ۔ اس سے کسی ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا کیوں کہ وہ اپنے پیچھے صرف تلخی، خوف اور شبہات چھوڑ جاتی ہے اور سماجی اور

معاشی ترقّی کی تمام کوششوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ ۔ ۔

"ہم ایک بین الاقوامی برادری کے رُکن ہیں اور یہ یقین رکھتے ہیں کہ انسانیت تمام قوموں سے بالاتر ہے اس لیے ہمیں خلوص نیّت کے ساتھ تمام جھگڑوں کے پُرامن فیصلے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہر سچّے انسان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جس حد تک ممکن ہو اپنی انسانیت کو برقرار رکھے۔

"جرمن فلسفی شاپن ہار کو یہ شکایت تھی کہ اکثر انسان بندر سے ملتے جلتے ہیں اُس نے افسوس کے ساتھ کہا کہ اس سے بھی بُری بات یہ ہے کہ دُور سے اُن پر انسان ہونے کا شبہہ ہوتا ہے۔ زیادہ تر جنگیں غلط فہمی، جھنجھلاہٹ، ناکامی، محرومی اور قومی جذبات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اگر ہم انسانوں کی طرح رہنا چاہتے ہیں تو ہمیں ان تمام جذباتی کیفیات پر قابو حاصل کرنا پڑے گا۔"

(ٹائمز آف انڈیا بمبئی کی رپورٹ سے ترجمہ ـــــ ۲۶ ستمبر ۶۵ء)

ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ان الفاظ میں ہندوستان کی صدیوں کا دِل دھڑک رہا ہے۔ یہ ہم سب کے دل کی آواز ہے اپنی سرحد، اپنی آزادی، اپنی غیر مذہبی جمہوریت کی حفاظت میں بحالتِ مجبوری ہتھیار اٹھانے کے باوجود

جنگ کی خباثت کو کبھی برکت کا نام نہیں دیا گیا۔ یہ چوں کہ ہماری مملکت کے صدر اور ہندوستان کے سب سے زیادہ ذمّے دار شہری کے الفاظ ہیں اِس لیے اِن میں حکومت کی جنگ اور امن کی پالیسی تلاش کی جا سکتی ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جنگ نفرت کے ساتھ نہیں بلکہ انتہائی دردمندی کے ساتھ لڑی گئی ہے۔ جنگ کی ناگزیر غارت گری اور تباہ کاری کے باوجود دِلوں میں اتحاد، محبّت اور امن کا جذبہ انگڑائیاں لیتا رہا ہے اور آج بھی ہر دل میں یہی خواہش ہے کہ ہماری سُلگتی ہوئی سرحدیں پُرامن ہو جائیں۔ وزیرِ اعظم شاستری کی ہر تقریر، ہر بیان سے اس نصب العین پر ہمارے بُنیادی عقیدے کی مہر ثبت ہوتی رہی ہے۔

ہماری قوم کے دل کی صحیح حالت کا اندازہ عصمت چغتائی کی ایک مختصر سی تقریر سے کیا جا سکتا ہے۔ عصمت نے کہا کہ :

"اگر میرا بھائی میری بیٹی کے سینے میں خنجر بھونکنے کی کوشش کرے گا تو میں اپنے بھائی کو قتل کر دوں گی اور پھر اس کی لاش پر بیٹھ کر روؤں گی۔"

کچھ ایسا ہی جذبہ عظیم امریکی شاعر والٹ وِھٹ مین کی ایک نظم میں ہے۔ وہ کہتا ہے :-

"مصالحت ایک لفظ ہے، آسمان کی طرح خوب صورت

"خوب صورت اس لیے کہ جنگ اور اس کی تباہ کاریاں ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے ختم ہو جائیں

"خوب صورت اس لیے کہ موت اور رات جو دو بہنیں ہیں ان کے
ہاتھ خون اور گندگی سے بھری ہوئی زمین
کو بار بار دھوئیں

"کیوں کہ میرا دشمن مر چکا ہے، ایک ایسا شخص جو میری طرح مقدس
اور ملکوتی تھا

"میں وہاں نظر ڈالتا ہوں جہاں وہ اپنے سفید بے خون
چہرے کے ساتھ تابوت میں لیٹا ہوا ہے ـــــ
ـــــ میں اس کے قریب آتا ہوں

"اور جھکتا ہوں اور جھک کر تابوت کے اندر اس کے سفید
چہرے کو بڑی نرمی کے ساتھ اپنے ہونٹوں سے
چھو لیتا ہوں"

بمبئی کے ادیبوں کے اسی جلسے میں گجراتی زبان کے ایک بڑے ادیب
گلاب داس بروکر نے اپنے پاکستان میں رہنے والے گجراتی قارئین کا ذِکر کیا جو
انھیں محبّت اور پیار کے تحفے بھیجتے رہتے ہیں۔
نئی دِلّی کی مشہور نامہ نگار خاتون امیتا مِلک کا بیان ہے کہ عین

اس زمانے میں جب ہندوستانی فوجیں لاہور سیکٹر کی طرف بڑھ رہی تھیں، دلّی میں نہ جانے کتنے لوگ جن کی حبّ الوطنی پر کوئی شبہہ نہیں کیا جا سکتا، لاہور اور سیال کوٹ کے گلی کوچوں کو فخر اور محبّت کے ساتھ یاد کر رہے تھے۔ظاہر ہے یہ وہ ہندو اور سکھ ہیں جو تقسیم کے وقت ان شہروں سے بے آبرو ہو کر نکلے تھے لیکن ان کے پیار کا یہ عالم تھا کہ وہ لاہور کو پیرس کی طرح حسین کہہ رہے تھے۔ حالاں کہ ملک کے قومی رہنما اور فوجی افسر بار بار یہ اعلان کر رہے تھے کہ ہندوستانی فوجوں کا مقصد لاہور پر قبضہ کرنا نہیں ہے پھر بھی یہ دُکھے ہوئے دِلوں کے ہندوستانی، لاہور کے لیے بیتاب تھے۔

(السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا، بمبئی)

خود وزیراعظم شاستری، وزیر دفاع چوہان اور ہمارے نائب صدر ڈاکٹر ذاکر حسین نے راشٹر پتی کی آواز میں آواز ملا کر ان جذبات کا اظہار کیا کہ ہماری لڑائی پاکستان کے عوام کے خلاف نہیں ہے۔ ہم ان کی ایک انچ زمین پر بھی قبضہ نہیں کرنا چاہتے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک خوشحال اور پُرامن زندگی بسر کریں اور ہمیں ہمارے ملک کے اندر چین سے رہنے دیں۔ جب جنگ اپنے شباب پر تھی اور روزانہ بمباری کی خبریں آ رہی تھیں اور دلّی اور بمبئی کی دُلھن کی طرح جگمگاتی ہوئی راتیں سیاہ پوش ہو گئی تھیں، اس وقت بھی ہر ایک کے دل میں یہی جذبہ تھا کہ یہ جنگ جلد سے جلد ختم ہو جائے۔

اسی زمانے میں میری نظم "کون دشمن ہے" شایع ہوئی۔ اس نظم کا اور اس کے بعد "صبح فردا" اور دوسری نظموں کا جس محبّت اور خلوص سے ہر حلقے میں استقبال کیا گیا وہ ہندوستانی قوم کے دل کی بنیادی شرافت کا ثبوت تھا۔ اردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، مراٹھی، گجراتی، پنجابی اخبارات اور رسائل نے اس نظم کو بار بار شایع کیا۔ دوستوں نے اسے ایک دوسرے کے پاس تحفے کی طرح بھیجا، پڑھنے والوں نے مجھے محبّت بھرے خطوط لکھے، آل انڈیا ریڈیو نے اسے مختلف شہروں سے بار بار نشر کیا اور کشمیر کے وزیر اطلاعات علی محمد طارق نے مجھے سری نگر سے لکھا کہ :۔

"نظم بے حد پسند کی گئی۔ کل مجھے ریڈیو سے سرحد کے اس پار رہنے والوں کو خطاب کرنا تھا۔ میں نے تقریر کم کی اور نظم زیادہ سنائی۔ پوسٹر اور پمفلٹ کی شکل میں نظم چھاپی جا رہی ہے"۔

میں نے بمبئی اور دِلّی کے درمیان مختلف شہروں میں صرف چند ہفتوں کے اندر یہ نظم سینکڑوں بار سنائی اور بعض محفلوں میں کئی کئی بار پڑھی اور ہر مرتبہ کسی بوڑھے، کسی جوان، کسی مرد یا کسی عورت کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ نم دیدہ آنکھیں ہندو اور مسلمان کی قید سے آزاد تھیں۔

میں نے اپنی تیس برس کی شاعرانہ زندگی میں اس سے اچھی نظمیں بھی

کہی ہیں، پر سکون زمانے میں بھی اور طوفانی دَور میں بھی۔ سیاسی ہنگاموں اور فرقہ وارانہ فسادات کی تباہ کاریوں کے عالم میں بھی، جب کہ جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں، میری کسی نظم کا اتنا شاندار استقبال نہیں ہوا۔ اس تجربے نے میرے یقین اور حوصلے کو بڑھا دیا ہے۔ میں اپنے ملک کی صحت مند جمہوری روایت پر فخر کرسکتا ہوں اور اعتماد کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہماری قوم کی روح گندی نہیں ہے اور اس پُرامن قوم کو جنگ باز قوم میں کبھی تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

یہ ہندوستان کی عظمت اور صداقت کی دلیل ہے کہ جنگ کے شباب کے زمانے میں بھی عام آدمی گلوگیر آواز میں یہ مصرعے میرے ساتھ دہرا رہے تھے۔

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا
مزا تو جب تھا کہ مِل کر علاجِ جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیرِ گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمھارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے

اِس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ تقسیم کے باوجود ہندوستان اور پاکستان کے عوام ایک دوسرے سے جتنے قریب ہیں دنیا کا کوئی ملک اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا۔ ہندوستان کے تمدّن کے ابتدائی سرچشمے ہڑپّا اور موہنجوداڑو تہذیب کی نشانیاں ٹکشلا اور سکھوں کی مقدس

زیارت گاہیں، پاکستان میں ہیں۔ گرونانک کے نقشِ قدم اب بھی اِس خاک میں تلاش کیے جا سکتے ہیں اور مسلمانوں کی تہذیب کی نشانیاں لال قلعہ، قطب مینار، تاج محل، نظام الدین اولیا اور خواجہ معین الدین چشتی کے مزار، غالبؔ اور میرؔ کے شہر دلّی اور لکھنؤ اور آگرہ سب ہندوستان میں ہیں۔ اُسی بنگالی زبان کی خوشبو ڈھاکے میں پھیلی ہوئی ہے جس سے کلکتے کی گلیاں معطّر ہیں ٹیگور اور نذرالاسلام دونوں جگہ کے قومی شاعر ہیں۔ اگر ایک دلّی اٹھ کر کراچی میں جا بسی ہے تو ایک لاہور دلّی میں آباد ہو گیا ہے۔ وہی اردو، وہی پنجابی، وہی سندھی زبانیں دونوں ملکوں کے درمیان دریاؤں کی طرح بہہ رہی ہیں۔ اگر فیضؔ ہندوستان میں مقبول ہیں تو مولانا ابوالکلام آزاد اور کرشن چندر کی تحریریں پاکستانیوں کی آنکھ کا سرمہ ہیں۔ ہماری تہذیب، ہمارا تمدّن، ہمارا رہن سہن، ہماری جذباتی افتاد، ہمارے پیار کرنے اور نفرت کرنے کے طریقے سب ایک سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی امریتا پریتم تقسیم کی غارت گری پر آنسو بہاتی ہے تو اپنی بے بسی کے عالم میں وارث شاہ کو آواز دیتی ہے۔ لاہور ریڈیو اور دلّی ریڈیو ایک ہی لَے میں ہیر گاتے ہیں پھر کیا اس کے بعد ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور نہیں ہیں کہ ان دو ملکوں کے درمیان ہونے والی جنگ سے زیادہ بھیانک کسی اور جنگ کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔

یہ غالباً ۱۰ یا ۱۱ ستمبر کی بات ہے میں اپنے گھر کی دوسری منزل سے اُتر رہا تھا کہ پہلی منزل کے زینے پر مجھے ایک سکھ دوست ملے جنھیں میں اتنا کم جانتا

تھا کہ پہچاننے میں تکلّف ہوا۔ وہ تھوڑی دُور میرے ساتھ چلتے رہے اور پھر پوچھنے لگے "کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ایک لفظ میں جواب دیا "جنگ"، سردار جی خاموش رہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے "ایک شعر سناؤں"، اور انھوں نے مجھے میرا ایک پُرانا شعر سُنایا سے

کام اب کوئی نہ آئے گا بس اک دل کے سوا
راستے بند ہیں سب کوچۂ قاتل کے سوا

یہ محبت اور دردمندی اگر پاکستان کو بھی نصیب ہو جائے تو ہم بڑی آسانی سے کوچۂ قاتل کو کوچۂ جاناں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ پاکستان کے ادیبوں اور دانش وروں نے نفرت کو اپنا سب سے بڑا حربہ بنا رکھا ہے۔ ہمیں پاکستان کے اندرونی حالات میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور نہ ہم پاکستان کے حکمرانوں سے بات کر سکتے ہیں لیکن ہم پاکستان کے شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کو مخاطب کرنے کا حق ضرور رکھتے ہیں۔ اور اگر ہماری آواز اُن تک پہنچ سکے تو ہم اُن سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے خلاف نفرت پھیلانے کے بجائے اگر وہ اپنے ملک کے اندر محبت، دوستی اور ہمدردی کی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں، اپنے عوام کے جمہوری حقوق کے لیے آواز بلند کریں، اور اپنے ملک کو سامراجی سازشوں کے جال سے باہر نکال لینے کی

جدوجہد میں اپنے قلم سے کام لیں تو ہندوستان اور پاکستان کے درمیان خوشگوار حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں ملکوں کی بقا اور ترقّی ہی کے لیے نہیں بلکہ سارے ایشیاء کی آزادی اور سارے عالم کے امن کے لیے ایک مبارک اقدام ہوگا۔

ہماری پیش کش امن ہے اور ہم اس کا جواب امن کے نعرے ہی کی شکل میں سُننا چاہتے ہیں۔

انسانی برادری کا جو خواب صوفیوں اور سنتوں نے دیکھا تھا جس کے ترانے رومی، حافظ، کبیر اور گرو نانک جیسی مقدّس ہستیوں نے گائے تھے، وہ خواب ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے۔ انسان اب بھی نسل، رنگ، مذہب، عقائد، سیاست، جغرافیائی حدود اور قوموں کے نام پر تقسیم ہے۔ جب انسان ان تمام اضافی تعریفوں سے بے نیاز ہو کر صرف انسان رہ جائے گا، وہ وقت ابھی بہت دُور ہے لیکن اس وقت کا تصوّر کرنا، اس کو محسوس کرنا دیکھ لینا اور اس کا جشن منانا ہر شاعر کا کام ہے۔

بمبئی

اکتوبر ۱۹۶۵ء سردار جعفری

پیراہنِ شرر

کھڑا ہے کون یہ پیراہنِ شرر پہنے
بدن ہے چُور تو ماتھے سے خون جاری ہے
زمانہ گزرا کہ فرہاد و قیس ختم ہوئے
یہ کس پہ اہلِ جہاں، حکمِ سنگ باری ہے
یہاں تو کوئی بھی شیریں ادا نگار نہیں
یہاں تو کوئی بھی لیلیٰ بدن بہار نہیں
یہ کس کے نام پہ زخموں کی لالہ کاری ہے

کوئی دِوانہ ہے، لیتا ہے سچ کا نام اب تک
فریب و مکر کو کرتا نہیں سلام اب تک
ہے بات صاف سزا اِس کی سنگساری ہے

۶ر اگست ۱۹۶۵ء

تم بھی آؤ

منزل دُور اندھیری راہیں
کانٹے کانٹے، جنگل جنگل
خشک لہو کے لمبے صحرا
خون کی بارش
سنّاٹوں کے بھاری پتّھر
جیسے اولوں کا پتھراؤ

تنہا راہیں کٹ نہ سکیں گی
تنہا منزل مل نہ سکے گی
پاؤں کے چھالے
دشت کے دِل میں
پھول کی صورت کھل نہ سکیں گے

خون کی بارش رُک نہ سکے گی
سنّاٹوں کے ہاتھ کے پتھّر
ختم نہ ہوں گے
میں تنہا ہوں، تم بھی تنہا
تنہا تنہا مر جائیں گے
میں آتا ہوں
تم بھی آؤ

۱۵ جولائی ۱۹۶۵ء

انٹلکچوَل

(یک طنزیہ نظم)

یہ کتابیں ہیں، یہ کافی کے حسیں پیالے ہیں
جن پہ یہ بنگال کے نقّاشوں نے
اپنے ہاتھوں سے بنائے ہیں عجب نقش و نگار
جیمنی رائے کی تصویریں بھی شرمندہ ہیں

اور یہ ٹوٹا ہوا سر، اینٹھے ہوئے ہاتھ اور پاؤں
سات آنکھوں کا فریب
گیارہ ہونٹوں کا طلسم
ایک تصویر ہے، مقصد ہے نہ مطلب کوئی
صرف اِک لذّتِ اظہار کا آئینہ ہے

کس کو معلوم حسین کیا ہے، بھیانک کیا ہے
ایک ہی شے ہے، جسے کہتے ہیں احساسِ نشاط
یا نشاطِ احساس
نہ تو اظہار ہی ممکن ہے، نہ ترسیل اس کی

جس کو سر سمجھا تھا، وہ سر بھی نہیں
آنکھ اور ہونٹ فقط رنگ کے کچھ دھبّے ہیں
اور دھبّے بھی نہیں
شاید اک لمحۂ بیتاب وگریزاں جم کر
قطرۂ خونِ دل و اشک بنا جاتا ہے

اور یہ لمحہ کہ ازل ہے نہ ابد
وقت کی جنبشِ پر کا یہ گریزاں سایہ
آتشیں بوسۂ لب ماضی و مستقبل کا
یاس و اُمید کی ہم آغوشی
موت اور زیست کا وصل

یہی انساں کی حقیقت، یہی انسان کی اصل

وقت اور موت کے پنجے سے ملے گی نہ نجات
سب ہی بے کار ہیں شمشاد قدوں کی باتیں
لبِ لعلیں کی مسیحا نفسی کے قصّے
حق و باطل کے تصادم کے تمام افسانے
اِک حقیقت ہے تو وہ روح کی تنہائی ہے

مئے تنہائی سے تنہائی کا پیمانہ بھرو
مئے تنہائی سے
مئے تنہائی سے

ا رجون ۱۹۶۵ء

یہ لہو

اِس لہو کا کیا کرو گے

یہ لہو

گرم جیسے بوسۂ لب، سُرخ جیسے رنگِ گُل

ننھے بچّوں کا تبسّم، بوڑھے ہونٹوں کی دُعا

نیم وا آنکھوں کا کاجل، نرم ہاتھوں کی حِنا

بربطِ مطرب کا نغمہ، سازِ شاعر کی نوا

عشق کا عہدِ وفا

یہ لہو کافر نہیں، مرتد نہیں، مسلم نہیں

وید و گیتا کا ترنّم، مصحفِ یزداں کا لحن

یہ کتابِ زندگی کا پہلا حرفِ دل نواز

آرزو کی سب سے پہلی راگنی

روحِ انجیلِ مقدس، جانِ توریت و زبور

خنجروں کی پیاس اس شعلے سے بُجھ سکتی نہیں

اس لہو کا کیا کرو گے

یہ لہو

گرم و سُرخ و نوجواں

خاک پر ٹپکے گا تو جل جائے گی دھرتی کی کوکھ

آسماں سے قطرۂ رحمت نہ برسے گا کبھی

کوئی دانہ پھر نہ اُپجے گا کبھی

کوئی کونپل مسکرائے گی نہ پھر مہکے گا پھول

یہ لہو ہونٹوں کی خوشبو، یہ لہو نظروں کا نور

یہ لہو عارض کی رنگت، یہ لہو دل کا سُرور

آفتابِ کوہِ فاراں، جلوۂ سینا و طور

شعلۂ حرفِ صداقت، سوزِ جانِ ناصبور

کلمۂ حق کا اُجالا، یہ تجلّی کا ظہور

یہ لہو، میرا لہو، تیرا لہو، سب کا لہو

۱۰ اگست ۱۹۶۵ء

دُعا

(ویت نام سے کشمیر تک خون آلودہ افق کے نام)

پھر چلا جنگ کا دیوتا
سُرخ شعلوں کے خنجر کو تانے ہوئے
خون کی پیاس سے
گوشت کی بھوک سے
چیختا اور چنگھاڑتا
آسمانوں پہ عفریت کی طرح اُڑتا ہوا
موت کی طرح دھرتی پہ چلتا ہوا

حُسن کی خیر ہو، خیر بچّوں کی معصومیت کی
فصلیں سہمی ہوئی
کھیت گھبرائے گھبرائے سے

جو فضائیں نئی کونپلوں کی مہک سے معطّر تھیں وہ
گندی بارود کی بو سے سرشار ہیں
خوں کے چھینٹے ہیں شبنم کے پیراہنوں پر
مندروں، مسجدوں اور کلیساؤں کے دامنوں پر

اس کا آغاز سب کچھ ہے،
انجام کچھ بھی نہیں
حاصلِ قتل و غارت ہے کیا؟
چند اُجڑے ہوئے شہر، جھلسے ہوئے راستے
سرنگوں بیوگی
اشک آلودہ و زخم خوردہ یتیمی

کوئی گوتم نہیں جس کی شفقت
دل کے زخموں پہ رکھ دے
اپنے غمگیں تبسّم کی درد آشنا چاندنی
کوئی گاندھی نہیں

آج جس کی شہادت سپر بن کے ہر وار کو روک لے
کوئی نہرو نہیں
جس کا دامن پکڑ کر یہ پوچھیں یہ کیا ہو رہا ہے

گیت کے دل میں خنجر ہے، الفاظ ہیں سر بریدہ
اپنے قبضے میں ایک بے بسی کے سوا کچھ نہیں
نالے بیکار، فریاد بے سود ہے
آؤ مل کر محبت کو آواز دیں
نیکیوں کو پکاریں

۱۶ر اگست ۱۹۶۵ء

قطعہ

دِل کو پھر زخمِ تمنّا نے دیا ہے بوسہ
جانِ بے تاب کو لو درد نے پھر پیار کیا
جب کبھی یاد کیا شاہدِ رسوائی نے
ہم نے بھی کوئے ملامت سے نہ انکار کیا

۱۷ اگست ۱۹۶۵ء

غزل

اُلجھے کانٹوں سے کہ کھیلے گُلِ تر سے پہلے
فکر یہ ہے کہ صبا آئے کدھر سے پہلے

جام و پیمانہ و ساقی کا گماں تھا لیکن
دیدۂ تر ہی تھا یاں دیدۂ تر سے پہلے

ابرِ نیساں کی نہ برکت ہے نہ فیضانِ بہار
قطرے گُم ہو گئے تعمیرِ گُہر سے پہلے

جم گیا دل میں لہو، سوکھ گئے آنکھ میں اشک
تھم گیا دردِ جگر، رنگِ سحر سے پہلے

قافلے آئے تو تھے نعروں کے پرچم لے کر
سرنگوں ہو گئی ہر آہ اثر سے پہلے

خونِ سر بہہ گیا، موت آ گئی دیوانوں کو
بارشِ سنگ سے طوفانِ شرر سے پہلے

سُرخیِ خونِ تمنّا کی مہک آتی ہے
دل کوئی ٹوٹتا ہے شاید گلِ تر سے پہلے
مقتلِ شوق کے آداب نرالے ہیں بہت
دل بھی قاتل کو دیا کرتے ہیں سر سے پہلے

۱۸ اگست ۱۹۶۵ء

غزل

وہ بہاریں وہ ہوائیں، جو زمیں زمیں چمن دیں
وہی مہر و ماہ لائیں، جو اُفق اُفق کرن دیں

یہ نیا زمانہ اے دل جو وقار کھو چکا ہے
اسے اپنی سربلندی، اسے اپنا بانکپن دیں

جو ہیں رند بھٹکے بھٹکے، جو ہیں ساقی بہکے بہکے
انھیں درسِ میکدہ دیں، انھیں ذوقِ انجمن دیں

بڑی دیر ہو چکی ہے کہ ہیں نوحہ خواں ستارے
چلو اب شبِ سیہ کو، نئی صبح کا کفن دیں

لبِ تیغ پر لہو ہے، لبِ زخم پر تبسّم
یہ حیاتِ تن برہنہ، اسے کیسا پیرہن دیں

نئی روح جسمِ خستہ کو عطا نہ ہو سکے تو
یہ کریں کہ روحِ نو کو، کوئی اِک نیا بدن دیں

نئے ابروؤں کو بجلی، نئے انکھڑیوں کو صہبا
نئے تیغ دیں نظر کو، نئے زلف کو شکن دیں

یہ زمیں مری زمیں ہے، یہ فلک مرا فلک ہے
انھیں صید کر چکی ہیں، مرے فکر کی کمندیں

اُسی بزم میں ملیں گے ابھی شعرِ تر کے ساغر
چلو بزمِ جعفری میں تمھیں جامِ فکر و فن دیں

۲۸ اگست ۱۹۶۵ء

غزل

وہی ہے وحشت، وہی ہے نفرت، آخر اس کا کیا ہی سبب
انساں انساں بہت رٹتا ہے، انساں انساں بنے گا کب

وید، اُپنی شد پرزے پرزے، گیتا قرآں ورق ورق
رام و کرشن و گوتم و یزداں، زخم رسیدہ سب کے سب

اب تک ایسا ملا نہ کوئی، دل کی پیاس بجھاتا جو
یوں میخانہ چشم بہت ہیں، بہت ہیں یوں تو ساقی لب

جس کی تیغ ہے دنیا اس کی، جس کی لاٹھی اس کی بھینس
سب قاتل ہیں، سب مقتول ہیں، سب مظلوم ہیں، ظالم سب

خنجر خنجر قاتل ابرو، دلبر ہاتھ، مسیحا ہونٹ
لہو لہو ہے شامِ تمنّا، آنسو آنسو صبحِ طرب

دیکھیے دن پھرتے ہیں کب تک، دیکھیے پھر کب ملتے ہیں
دل سے دل، آنکھوں سے آنکھیں، ہاتھ سے ہاتھ اور لب سے لب

زخمی سرحد، زخمی قومیں، زخمی انساں، زخمی ملک
حرفِ حق کی صلیب اٹھائے، کوئی مسیح تو آئے اب

۲۹ اگست ۱۹۶۵ء

غزل

کس سے پوچھیں، کون بتائے، صبح کی کب پھوٹے گی کرن
رات کی سرحدِ مقتل، باندھ کے نکلو سر سے کفن

لے کر پھر قندیلِ محبّت، اُترو دل کے اندھیرے میں
روح کی تاریکی کو روشن کرتی نہیں سورج کی کرن

جشنِ ستم ہے، ناچ رہے ہیں خنجر، تیغیں گاتی ہیں
خون آلودہ شامِ گیسو، زخمِ رسیدہ صبحِ بدن

کعبۂ دل میں بیٹھے ہیں، اب بھی صدیوں کے فرسودہ بُت
رنگ و نسل و شیخ و برہمن، مذہب و ملّت، ملک و وطن

یہ دنیا گمراہ ہے اب تک، پھر بولو اے سنتِ کبیر
ایک ہی سونے کے سب گہنے، ایک ہی مٹّی کے برتن

ایک ہی نور ہے سب شمعوں میں، ایک ہی رس سب میووں میں
اپنے منہ کو میٹھا کر لو، کر لو آنکھوں کو روشن
ایک پرستاں کی سب پریاں، ایک گلستاں کے سب پھول
نیلے نیلے، پیلے پیلے، اُودے اُودے پیراہن
خون کی نہریں سینچ رہی ہیں انسانی لاشوں کے کھیت
بھوک کے پیٹ کے کام نہ آئیں گے یہ زخموں کے خرمن
ہم نے تو روٹی کی خاطر تن کے ٹکڑے بیچے ہیں
تم نے آخر کس کی خاطر بیچ دیا ہے اپنا من

۳۰ اگست ۱۹۶۵ء

جنگ بازوں کا فرمان

خونؔ و بارود کی بوٗ کو بھی معطّر سمجھو
حکم اب یہ ہے کہ زخموں کو گلِ تر سمجھو

موت کی گود سے لو لذّتِ ہم آغوشی
خمِ تلوار کو محبوب کا پیکر سمجھو

جنگ کو امن کہو، امن کو دو جنگ کا نام
نشترِ خار کو پھولوں کے برابر سمجھو

دولتِ دیدۂ تر چار طرف عام ہوئی
آنسوؤں کو بھی مئے ناب کا ساغر سمجھو

روحِ ابلیس کو دو حضرتِ جبریل کا نام
جھوٹ کو حکم خدا، حرفِ پیمبر سمجھو

۳ ستمبر ۱۹۶۵ء

کون دشمن ہے

یہ ٹینک، توپ، یہ بمبار، آگ بندوقیں
کہاں سے لائے ہو، کس کی طرف ہے رُخ اِن کا
دیارِ وارث و اقبالؔ کا یہ تحفہ ہے؟
جگا کے جنگ کے طوفاں زمینِ نانکؔ سے
اُٹھے ہو برق گرانے کبیرؔ کے گھر پر

غلام تم بھی تھے کل تک، غلام ہم بھی تھے
نہا کے خون میں آئی تھی فصلِ آزادی

ابھی تو صبح کی پہلی ہوائیں سنکی ہیں
ابھی شگوفوں نے کھولی نہیں ہے آنکھ اپنی

ابھی بہار کے لب پر ہنسی نہیں آئی
نہ جانے کتنے ستارے بُجھی سی آنکھوں کے
نہ جانے کتنے فسردہ ہتھیلیوں کے گلاب
ترس رہے ہیں ابھی رنگ و روشنی کے لیے

ہمارے پاس ہے کیا دردِ مشترک کے سوا

مزا تو جب تھا کہ مِل کر علاجِ جاں کرتے
خود اپنے ہاتھ سے تعمیرِ گلستاں کرتے
ہمارے درد میں تم اور تمھارے درد میں ہم
شریک ہوتے تو پھر جشنِ آشیاں کرتے

مگر تمھاری نگاہوں کا طور ہے کچھ اور
یہ بہکے بہکے قدم اُٹھ رہے ہیں کس جانب؟
کدھر چلے ہو یہ شمشیر آزمانے کو؟

سمجھ لیا ہے جسے تم نے ملک کی سرحد
وہ سرحدِ دل و جاں ہے، ہمارا جسم ہے وہ
حسین، بلند، مقدّس، جوان، پاکیزہ
ہے اس کا نام خیابانِ جنّتِ کشمیر
ہے اس کا نام گلستانِ دلّی و پنجاب
ہم اس کو پیار سے کہتے ہیں لکھنؤ بھی کبھی

تم اس کو تیغ کے ہونٹوں سے چھو نہیں سکتے
ادب سے آؤ کہ غالبؔ کی سرزمین ہے یہ
ادب سے آؤ کہ ہے میرؔ کا مزار یہاں
نظام و کاکی و چشتی کے آستانے ہیں
جھکا دو تیغوں کے سر بارگاہِ رحمت میں

ہمارے دل میں رفاقت بھی اور پیار بھی ہے
تمھارے واسطے یہ روح بے قرار بھی ہے
اگرچہ کہنے کو جی چاہتا نہیں لیکن
جوابِ اہلِ ہوس، تیغِ آب دار بھی ہے

اُدھر بہن ہے کوئی، کوئی بھائی، کوئی عزیز
گزشتہ بادہ پرستوں کی یادگار کوئی
رفیقِ محبس و زنداں، رفیقِ دار کوئی
ہماری طرح سے رسوائے کوئے یار کوئی
لبوں پہ جن کے تبسّم ہے عہدِ رفتہ کا
نظر میں خواب ہیں بیتے ہوئے زمانے کے
دلوں میں نور چراغِ امیدِ فردا کے

وہ سب جو غیر نظر آ رہے ہیں، اپنے ہیں

اِدھر بھی حلقۂ یاراں، ہجومِ مُشتاقاں
اِدھر بھی چاہنے والوں کی کچھ کمی ہی نہیں
ہزاروں سال کی تاریخ ہے ثبوت اس کا
کھڑے ہیں سینے پہ زخموں کے گل کھلائے ہوئے
دیارِ ہیر کی یادوں سے دل جلائے ہوئے
چناب و جھیلم و راوی سے لَو لگائے ہوئے

ہمارے بیچ میں حائل ہیں آگ کے دریا
تمھارے اور ہمارے لہو کے ساگر ہیں
بہت بلند سہی نفرتوں کی دیواریں
ہم ان کو ایک نظر میں گرا بھی سکتے ہیں
تمام ظلم کی باتیں بھلا بھی سکتے ہیں
تمھیں پھر اپنے گلے سے لگا بھی سکتے ہیں
مگر یہ شرط ہے تیغوں کو توڑنا ہوگا
لہو بھرا ہوا دامن نچوڑنا ہوگا
پھر اس کے بعد نہ تم غیر ہو نہ غیر ہیں ہم

تم آؤ گلشنِ لاہور سے چمن بردوش
ہم آئیں صبحِ بنارس کی روشنی لے کر
ہمالیہ کی ہواؤں کی تازگی لے کر
اور اُس کے بعد یہ پوچھیں کہ کون دشمن ہے؟

۱۲ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہرِ تمنّا

(دھلی کے نام)

اے دیارِ دوست، اے شہرِ تمنّا، آج کیوں
آ رہی ہے یاد تیری دلبری کی بار بار
دردِ دل کی کیفیت پہلے کبھی ایسی نہ تھی
روحِ شاعر یوں تو رہتی ہے ہمیشہ بے قرار
جنگ کی تاریک شب ہے اور بلاؤں کا نزول
ہو نہ جائیں یک بہ یک تیری فضائیں شعلہ بار
لُٹ نہ جائے یہ ضیا، یہ رونقِ دیوار و در
راکھ ہو جائے نہ جل کر تیرے کوچوں کی بہار
منتظر ہوں میں بھی اس جشنِ مسرّت کے لیے
جس کی خاطر لمحہ لمحہ ہے سراپا انتظار

تجھ کو لے لے اپنے حلقے میں جوانی کی امنگ
سرنگوں ہونے نہ پائے تیری عظمت کا حصار
تیری دیواروں سے ٹکرائیں بلائیں اپنا سر
تیرے دروازے سے جائے ہو کے آفت شرمسار
مشعلِ رخسار سے روشن ہوں تیرے بام و در
بوئے گیسوئے معنبر سے ہوں گلیاں عطر بار
تیرے دیوانوں پہ برسیں مہرباں نظروں کے تیر
عشق کے سینے پہ ہو زلفوں کی تیغِ آب دار
نغمۂ جمہوریت ہو تیرے بازاروں کا شور
کارخانے گائیں تیرے گیت جیسے آبشار
پھول سی آغوش میں بچوں کو مائیں بھینچ لیں
پھول سے ہونٹوں سے بچے پھر کریں ماؤں کو پیار
پھر اُڑیں ہر سمت ہاتھوں کی سنہری تتلیاں
دھو دے پھر گردِ مصیبت کو تبسم کی پھوار
پھر کھُلیں در حسن کی محبوب باہوں کی طرح
کھڑکیوں سے ہو طلوعِ جلوۂ دیدارِ یار

جگمگا اُٹھیں ترے بے نور، بے رونق چراغ

تیرے ایوانوں کی گردن میں ہوں پھر شمعوں کے ہار

آرزوئیں پھر کہیں افسانۂ تعمیرِ نو

کشتیِ دل سے ہو طوفانِ تمنّا ہم کنار

دُور ہو کر بھی میں تجھ سے آج ہوں نزدیک تر

اے دیارِ دوست، اے شہرِ تمنّا، کوئے یار

جل رہی ہے دل میں تیری شمعِ محبوبی کی لَو

رُوح میں اُتری ہوئی ہے حسن کے خنجر کی دھار

تیری پیشانی کو چومے فتح و نصرت کی کرن

تیرے قدموں پر ہو قرباں گردشِ لیل و نہار

۱۳ ستمبر ۱۹۶۵ء

دستِ فریاد

چھاؤں ہے جنگ کے میدان میں تلواروں کی
دل ہِلا دیتی ہے للکار جگرداروں کی
ایک بھی دُشمنِ جاں بچ کے نہ جانے پائے

وہ جو ہتھیار لیے آتے ہیں، سب دُشمن ہیں
جس نے ہتھیار دیے وہ بھی تو دُشمن ہوگا
آج ہی کل میں مگر آنے کو ہے روزِ حساب
دستِ فریاد میں کِس کِس کا نہ دامن ہوگا

۱۵ر ستمبر ۱۹۶۵ء

اشکِ ندامت

کہاں ہیں اشکِ ندامت، کہ دھوئیں دامن سے
لہو کا داغ، دِلوں سے کدورتوں کا غبار
یہ اشک ہوں تو ابھی رُوح پر جلا ہو جائے
یہ آدمی کہ جو ہے نفرتوں کے حلقے میں
یہ آدمی جو ہوا و ہوس کے دام میں ہے
شکار اپنی بنائی ہوئی سیاست کا
مقامِ عشق پہ فائز ہو اور خدا ہو جائے

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

صبحِ فردا

اسی سرحد پہ کل ڈوبا تھا سورج ہو کے دو ٹکڑے
اسی سرحد پہ کل زخمی ہوئی تھی صبحِ آزادی
یہ سرحد خون کی، اشکوں کی، آہوں کی، شراروں کی
جہاں بوئی تھی نفرت اور تلوار یں اُگائی تھیں

یہاں محبوب آنکھوں کے ستارے تلملائے تھے
یہاں معشوق چہرے آنسوؤں میں جھلملائے تھے
یہاں بیٹوں سے ماں، پیاری بہن بھائی سے بچھڑی تھی

یہ سرحد جو لہو پیتی ہے اور شعلے اُگلتی ہے
ہماری خاک کے سینے پہ ناگن بن کے چلتی ہے
سجا کر جنگ کے ہتھیار میداں میں نکلتی ہے

میں اِس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں، صبحِ فردا کا

(۲)

یہ سرحد پھول کی، خوشبو کی، رنگوں کی، بہاروں کی
دھنک کی طرح ہنستی، ندیوں کی طرح بل کھاتی
وطن کے عارضوں پر زلف کے مانند لہراتی
مہکتی، جگمگاتی، اِک دولھن کی مانگ کی صورت
کہ جو بالوں کو دو حصّوں میں تو تقسیم کرتی ہے
مگر سیندور کی تلوار سے، صندل کی اُنگلی سے

یہ سرحد دلبروں کی، عاشقوں کی، بیقراروں کی
یہ سرحد دوستوں کی، بھائیوں کی، غمگساروں کی
سحر کو آئے خورشیدِ درخشاں پاسباں بن کر
نگہبانی ہو شب کو آسماں کے چاندتاروں کی
زمیں پامال ہو جائے بھرے کھیتوں کی یورش سے
سپاہیں حملہ آور ہوں درختوں کی قطاروں کی

خدا محفوظ رکھے اس کو غیروں کی نگاہوں سے
پڑیں نظریں نہ اس پر خوں کے تاجر تاجداروں کی
کچل دیں اس کو فولادی قدم بھاری مشینوں کے
کرے یلغار اس پر ضرب کاری دستکاروں کی
اُڑیں چنگاریوں کے پھول پتھر کے کلیجے سے
جُھکے تیشوں کی محرابوں میں گردن کوہساروں کی
لبوں کی پیاس ڈھالے اپنے ساقی اپنے پیمانے
چمک اُٹھیں مسرت سے نگاہیں سوگواروں کی
محبّت حکمراں ہو، حسن قاتل، دل مسیحا ہو
چمن میں آگ برسے شعلہ پیکر گل عذاروں کی
وہ دن آئے کہ آنسو ہو کے نفرت دل سے بہہ جائے
وہ دن آئے یہ سرحد بوسۂ لب بن کے رہ جائے

(۳)

یہ سرحد من چلوں کی، دل جلوں کی، جاں نثاروں کی
یہ سرحد سرزمینِ دل کے بانکے شہسواروں کی

یہ سرحد کج کلاہوں کی، یہ سرحد کج اداؤں کی
یہ سرحد گلشنِ لاہور و دِلّی کی ہواؤں کی
یہ سرحد امن و آزادی کے دل افروز خوابوں کی
یہ سرحد ڈوبتے تاروں، اُبھرتے آفتابوں کی
یہ سرحد خوں میں لتھڑے پیار کے زخمی گلابوں کی

میں اس سرحد پہ کب سے منتظر ہوں صبحِ فردا کا

۲۵ ستمبر ۱۹۶۵ء

ہمارے نام

ستارے آسماں پر نقرئی حرفوں سے لکھتے ہیں
تمہارا نام تاریکی کے سینے پر اُبھرتا ہے
یہی تارے تھے جن کو جوڑ کر مُدّت ہوئی تم نے
اندھیری رات کے ماتھے پہ میرا نام لکھّا تھا
یہ نورانی فرشتے ناچ اُٹھے تھے، مسکرائے تھے
تمہاری ایک انگشتِ حنائی کے اشارے پر
ہمارے جسم گیلی گھاس کی شبنم سے تر ہو کر
فرازِ آسماں سے کہکشاں کو کھینچ لائے تھے
نظر کانپی تھی لب نا آشنا لب تھرتھرائے تھے

زمیں پر میں بھی تنہا ہوں، زمیں پر تم بھی تنہا ہو
ہجومِ بزمِ یاراں میں، ہجومِ غم گساراں میں

ہزاروں فاصلے ہیں منزلوں کے رہگزاروں کے
ہزاروں فاصلے دریاؤں کے اور کوہساروں کے
ہزاروں فاصلے ایسے کہ ناپے جا نہیں سکتے

مگر نیلی فضا میں آسمانوں کی بلندی پر
ہمارے نام ہیں دو دوست، دو معشوق، دو عاشق
جنھوں نے پیار سے بانہوں میں باہیں ڈال رکھی ہیں

یہ روشن دائرے، ہیروں کی محرابوں کے سائے میں
کبھی جاکر ثریا سے، کبھی زہرہ سے ملتے ہیں
کبھی کرتے ہیں باتیں ماہ و مریخ و عطارد سے
کبھی یہ تیرتے ہیں کہکشاں کی گہری جھیلوں میں
نہاتے ہیں کبھی رنگِ شفق کے آبشاروں میں

لیے پھرتی ہے ان کو گردشِ شام و سحر لیکن
یہ دامِ گردشِ شام و سحر کو توڑ دیتے ہیں

یہ لافانی ستارے عصرِ حاضر کا مقدّر ہیں
زمیں، رقّاصۂ افلاک کے ماتھے کا جھومر ہیں

کبھی دہلی، کبھی شیراز پر یہ جگمگاتے ہیں
کبھی لندن، کبھی نیویارک پر یہ مسکراتے ہیں
کبھی یہ ماسکو کے سر پہ تاجِ نور رکھتے ہیں

کبھی یہ دُشمنوں کی سرحدوں کو پار کرتے ہیں
کبھی چشموں، کبھی باغوں کو جُھک کر پیار کرتے ہیں
پرُوتے ہیں کبھی زلفوں میں موتی مہ جبینوں کی
کھٹکتے ہیں کبھی نظروں میں اپنے نکتہ چینوں کی
کبھی یہ جھانکتے ہیں اِک عروسِ نو کی آنکھوں میں
کبھی مشعل بہ کف، بے آسرا مایوس راتوں میں
کبھی بھٹکے ہوئے رہرو کو یہ رستہ دکھاتے ہیں
کبھی ٹھہرے ہوئے پانی کے اندر ڈوب جاتے ہیں
کبھی یہ کھڑکیوں پر پھول کی صورت برستے ہیں

کبھی اپنی بلندی سے زمیں والوں پہ ہنستے ہیں
کبھی یہ کھیلتے ہیں مہ وشوں سے، ماہ پاروں سے
بُلاتے ہیں کبھی بچّوں کو آنکھوں کے اشاروں سے

کبھی بڑھتی ہوئی فوجوں کے اوپر سے گزرتے ہیں
جنازوں میں شہیدانِ وفا کے ساتھ چلتے ہیں
ٹھہرتے ہیں کبھی کشمیر کے یہ لالہ زاروں میں
کبھی جمنا کی موجوں میں، کبھی گنگا کے دھاروں میں
کبھی تبدیل ہو جاتے ہیں آتش میں، شراروں میں

جلا سکتی نہیں جنگوں کی آگ ان ماہتابوں کو
بُجھا سکتی نہیں بارود روشن آفتابوں کو

ہمارے نام حرفِ خیر و برکت، نور و نزہت ہیں
ہمارے نام امن و دوستی، عشق و شرافت ہیں
ہمارے نام جنگ آلودہ و خونخوار دُنیا میں

اشارہ آدمیت کا ہیں، نیکی کی ضمانت ہیں
ہمارے نام طاقت ہیں، لطافت ہیں، صداقت ہیں
ہمارے نام لافانی و روحانی مسرّت ہیں

ہمارے نام تاریکی کے سینے پر اُبھرتے ہیں
اندھیری رات کے بے نور ماتھے پر چمکتے ہیں

۲۰ ستمبر ۱۹۶۵ء

غزل

بیٹھے ہیں جہاں ساقی، پیمانۂ زر لے کر
اس بزم سے اُٹھ آئے ہم دیدۂ تر لے کر

یادوں سے تری روشن محرابِ شبِ ہجراں
ڈھونڈھیں گے تجھے کب تک قندیلِ قمر لے کر

کیا حسن ہے دنیا میں، کیا لطف ہے جینے میں
دیکھے تو کوئی میرا اندازِ نظر لے کر

ہوتی ہے زمانے میں کس طرح پذیرائی
نکلو تو ذرا گھر سے اِک ذوقِ سفر لے کر

راہیں چمک اُٹھیں گی خورشید کی مشعل سے
ہمراہ صبا ہوگی خوشبوئے سحر لے کر

مخمل سی بچھا دیں گے قدموں کے تلے ساحل
دریا اُبل آئیں گے صد موجِ گہر لے کر

پہنائیں گے تاج اپنا پیڑوں کے گھنے سائے
نکلیں گے شجر اپنے خوش رنگ ثمر لے کر
لپکیں گے گلے ملنے سرو اور صنوبر سب
اٹھیں گے گلستاں بھی شاخِ گُلِ تر لے کر
ہنستے ہوئے شہروں کی آواز بلائے گی
لب جام کے چمکیں گے سو شعلۂ تر لے کر
افلاک بجائیں گے ساز اپنے ستاروں کا
گائیں گے بہت لمحے انفاسِ شرر لے کر
یہ عالمِ خاکی اِک سیارۂ روشن ہے
افلاک سے ٹکرا دو تقدیرِ بشر لے کر

۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء

جرعہ جرعہ، قطرہ قطرہ

انجم و مہتاب کے سائے میں جب آئے گی رات
نیلگوں زلفوں کے پیچ و خم میں بل کھائے گی رات
مسکرائے گی گریبانوں میں پھولوں کی طرح
آنچلوں کی ریشمی شکنوں میں لہرائے گی رات
مطربِ رنگیں نوا کے ساتھ ہو گی نغمہ سنج
ساقیِ کافر ادا کے ساتھ اٹھلائے گی رات
شعلہ پیکر قامتوں کے حلقۂ آغوش میں
کہکشاں در کہکشاں پھر رقص میں آئے گی رات
چھیڑ دے گی جنبشِ مژگاں کا سازِ دلبری
عارض و لب کے نہکتے پھول برسائے گی رات
عشق کے ہونٹوں سے پی کر جرعۂ آبِ حیات
حُسن کے پیمانۂ سیمیں کو چھلکائے گی رات

گنگنائے گی جواں پیڑوں کی پازیبوں کے سنگ
ساعدوں کی شمعِ کافوری میں جل جائے گی رات

چشمِ ساقی ہی میں ٹھہرے گی نہ زلفِ بادہ میں
ساغر و مینا کے سینے سے اُبل جائے گی رات

جرعہ جرعہ کر کے ذوقِ تشنگی پی جائے گا
قطرہ قطرہ کر کے پیمانوں میں ڈھل جائے گی رات

رنگِ خونِ آرزو بن کر سحر ہو گی طلوع
دردِ دل بن کر مگر سینے میں رہ جائے گی رات

رنگ و بو کے قافلے، غنچوں کی آوازِ جرس
دور بادِ صبح کی صورت نکل جائے گی رات

ہم نہ ہوں گے پر قدح خوارانِ بزمِ نو کے ساتھ
لے کے صہبائے طرب کے جام پھر آئے گی رات

۱۸ر جولائی ۱۹۶۵ء

چار شعر

کبھی ملے نہ دلِ غم زدہ کو غم سے نجات
کبھی تمام نہ ہو تشنہ آرزو کا سفر
خیال و خواب کے سینے میں جگمگاتا رہے
جمالِ یار ترے حسن و نور کا نشتر
یوں ہی چھلکتا رہے محفلِ تمنّا میں
پیالۂ دلِ خوں گشتہ، جامِ دیدۂ تر
یوں ہی چمکتے رہیں دامن و گریباں میں
ستارۂ سحری بن کے آنسوؤں کے گہر

۲ر اکتوبر سنہ ۱۹۶۵ء

موسموں کا گیت

(کالی داس کی نظم "رِت سنگھار" سے ماخوذ)

کتنے دل کش ہیں مرے ملک کے موسم، ان میں
حُسن کی بات کریں، عشق پر اصرار کریں
نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ
پھول کی طرح سے ذکرِ لب و رُخسار کریں
مصحفِ حق کی طرح کھولیں کتابِ دل کو
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں
فصلِ گل فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں ہے مگر
موسمِ جنگ نہیں، موسمِ ویرانہ نہیں

(ا)

گرمیاں آئی ہیں برساتی ہوئی انگارے
دیکھنا شعلہ بدن دھوپ پہ آیا ہے شباب

لوگ تالابوں میں اُترے ہیں نہانے کے لیے
تہہ نشیں ہوتی چلی جاتی ہے ہر چادرِ آب
اِک ذرا دیر کو تھوڑا سا سکوں ملتا ہے
جسم کو چھوتا ہے جس وقت خنک شام کا ہاتھ
اِتنی سوزش ہے کہ بس سرد ہوئی گرمیِ عشق
پیار کے مُنہ سے نکلتی ہی نہیں پیار کی بات

نیند آسکتی نہیں عشق کے بیماروں کو
اِن دنوں جاگتے رہنے کے بہانے ہیں بہت
تیرتی رہتی ہیں وینا کی سُریلی تانیں
گیت شب بھر ہیں بہت، نرم ترانے ہیں بہت
آبِ صندل میں ڈبوئے ہوئے پنکھوں کی ہوا
اپنے مہکے ہوئے ہاتھوں سے تھپک دیتی ہے
اور دھڑکتے ہوئے سینوں پہ دھڑکتے ہوئے ہار
ہر لڑی موتی کی بس جان ہی لے لیتی ہے

آگ برساتی ہوئی دھوپ کی کرنوں کا جلال

تیز اور تُند ہو جس طرح ہَوَن کا شعلہ
دشمنی سانپ کی طاؤس سے بس ختم ہوئی
وہ بھی طاؤس سے دیرینہ عداوت بھولا
اتنی گرمی ہے کہ کُھلتی نہیں منقار اس کی
بھوک باقی نہیں، کیا جائے غذا کے پیچھے
دھوپ کی جلتی ہوئی آگ سے بچنے کے لیے
سانپ آ بیٹھا ہے رنگین پروں کے نیچے

میری جاں، اے مرے نغموں کی جواں شہزادی
فصلِ گرما سحر و شام تجھے راس آئے
چاندنی رات سجائے تری مہکی ہوئی سیج
جسمِ سیمیں کے لیے پھولوں کے تحفے لائے
تیری صبحوں کو رکھیں سرد کنول کی جھیلیں
ٹھنڈے پانی کے اُچھلتے ہوئے فوّاروں سے
تیری شاموں کو ترے چاہنے والے مل جائیں
جو چُنیں پھول ترے حُسن کے گلزاروں سے
دھوپ بے جان ہو، گیتوں کی گھٹا چھائی ہو

تُو ہو، احباب ہوں، اور گوشۂ تنہائی ہو

(۲)

دیکھنا میگھ کا وہ شاہسوار آ پہنچا
گونج اُٹھے کوہ و دمن، گونج اُٹھے دشت و جبال
گھن گرج وہ ہے مری جان، کہ شاہی ڈنکے
جس طرح بجتے ہیں میداں میں بہ صد شانِ جلال
بجلی لہراتی ہے شعلوں کا سنہری پرچم
ابر کے فیل پہ بارش کا شہنشاہ سوار
گھر سے سب اس کے سواگت کو نکل آئے ہیں
غول عشّاق کے، بدمست حسینوں کی قطار

فوجیں بادل کی چلی آتی ہیں کرتی ہوئی کوچ
چوٹ پڑتی ہے گرجتے ہوئے نقّاروں پر
آگ کی ڈور ہے، رنگوں کی کڑکتی ہے کمان
بجلیاں باندھی گئیں اِندر دھنش پر کس کر
چھینٹا بارش کا ہے یا تیروں کی بوچھاریں ہیں
جو کیے دیتی ہیں متوالوں کے دل کو چھلنی

عشق تو زخم رسیدہ ہے، ستم دیدہ ہے
آج تو حُسن پہ بھی ہوتی ہے ناوک فگنی

ایسا لگتا ہے کہ ہنسنے لگا جنگل سارا
اور نیپا کے درختوں میں نئے پھول کھلے
شاخیں بیتاب ہواؤں میں زرت کرنے لگیں
جیسے مدہوشی کے عالم میں کوئی رقص کرے
آئی نورستہ شگوفوں کے لبوں پر ہلکی
دل نوازانہ تبسُّم کی دل آویز لکیر
درد باقی ہے تپش کا نہ نشاں گرمی کا
نکلی برسات جو پہنے ہوئے پوشاکِ حریر

تجھ کو اے نور کی تصویر، مبارک ہوں یہ دن
لے کے آئے ہیں جو گھنگھور گھٹاؤں کا پیام
آتشِ شوق میں جل جائے جوانی تیری
نَو عروسی کو تری عیش و مسرّت کا سلام
زندگی جس سے تر و تازہ ہے اس بارش سے

سبز بیلوں کی طرح تو بھی تر و تازہ رہے
میری محبوبہ پہ ہو رحمتِ حق کی بارش
جگمگاتا ہوا رخسار رہے غازہ رہے

(۴۳)

لو وہ آتی ہے خزاں، گاؤں کی کنواری جیسے
ناز و انداز کی جاں، حسن کی نازک مورت
بالیاں دھان کی بالوں میں سجا رکھی ہیں
دونوں رخسار دمکتے ہیں کنول کی صورت
جسم پر گھاس کے پھولوں کا مہکتا ملبوس
اپنی رفتار سے ہنسوں کو بھی شرماتی ہوئی
اس کے سواگت میں چہک اٹھتی ہیں چڑیاں جیسے
کسی معشوقہ کی پایل کی صدا آتی ہوئی

رات کی مانگ میں تاروں کی سنہری افشاں
تاجِ مہتاب سے کچھ اور بھی روشن ہے جبیں
پیرہن، چاند کی کرنوں کا چمکتا ریشم
اتنا شفاف کہ بادل کا کہیں نام نہیں

ہنستی ہے دیکھ کے مُنہ چاند کے آئینے میں
پڑتی ہے سانولے مکھڑے پہ تبسّم کی پھوار
ایسا لگتا ہے کہ نوعمر ہے، دوشیزہ ہے
ابھی آنے کو ہے بھرپور جوانی کی بہار

دھان کے کھیت، وہ اِستادہ ثمر بار درخت
جھوم اُٹھتے ہیں جب آتے ہیں ہوا کے جھونکے
لے کے آغوش میں جب ناچتی ہے بادِ خزاں
پھول ہی پھول برس جاتے ہیں پیڑوں کے تلے
جُھرجُھری لیتی ہیں آہستہ کنول کی جھیلیں
کلیاں مُنہ چوم کے کلیوں کا جھجھک جاتی ہیں
عشق کے ماروں کو آتا ہے محبّت کا خیال
خواہشیں دل کے کٹوروں سے چھلک جاتی ہیں

اس خزاں میں بھی مگر تو ہے بہاروں کی بہار
نوجوان جسم سے گل رنگ شگوفے پھوٹیں
پیار کے ہاتھ محبّت سے سنواریں تجھ کو

کبھی ہونٹوں، کبھی مشتاق نگاہوں سے چھوئیں
مسکرائے ترے پیروں کی حنا، اور مہکے
زعفراں جسم کی، سینے کا سنہرا صندل
دل پہ عشّاق کے زلفوں کی گھٹائیں برسیں
ڈھونڈھیں خود بھونروں کو ہنستی ہوئی آنکھوں کے کنول

(۴)

جا چکی فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں آئی
کوئی ننھا سی کلی شاخ پہ نم دیدہ ہے
اپنے دامن میں لیے اپنے سنہرے موتی
خوشۂ گندمِ نو کھیت میں بالیدہ ہے
غم نہ کر جانِ جہاں، لٹ گئی گر دولتِ گل
سخت جاں پھول کوئی اب بھی نظر آتا ہے
برف و باراں سے بھی بجھتا نہیں شعلہ اُس کا
سرد اور تیز ہواؤں میں بھی لہراتا ہے

برف آلودہ ہواؤں میں لرزتی بیلیں
یاد آتی ہے انھیں موسمِ تابستاں کی

کچھ تو مل جاتی ہے یادوں سے حرارت دل کو
جُستجُو درد کو ہے کھوئے ہوئے درماں کی
زندگی کی وہ تڑپ ہے کہ ابھی زندہ ہیں
پھر بھی پیلی سی نظر آتی ہیں کُمھلائی ہوئی
جس طرح ہجر کی ماری ہو سُہاگن کوئی
جیسے دوشیزہ کوئی عشق کی ترسائی ہوئی

کاش! یہ فصلِ زمستاں ہو تری فصلِ امید
ہر گھڑی آئے مسرّت کے فسانے لے کر
منتظر رہتی ہیں جس کے لیے دوشیزائیں
روز و شب آئیں وہ راحت کے خزانے لے کر

گاؤں میں شور ہے، ہنگامہ ہے، آوازیں ہیں
پک چکے کھیت تو کھلیان میں آتا ہے اناج
دُور آکاش پہ اُڑتے ہوئے بگلوں کی قطار
حسن کو تیرے ملے عشق و محبّت کا خراج

(۵)

اے مری جاں، مجھے اذنِ سخن آرائی دے

نو بہار آئی ہے، نغموں پہ بہار آجائے
نو بہارانِ گل اندام کے دل ہنسنے لگے
ان کی بے تاب تمنّا کو قرار آجائے

بھر گئی ناج کے ڈھیروں سے زمیں کی گودی
بڑھ گئی اور بھی ہر سینے کی شوق انگیزی
دُور سے آتی ہے سارس کے کلیجے کی پکار
خوابوں میں ہوتی ہے، جذبات کی رنگ آمیزی

فصل یہ وہ ہے کہ خوش ہوتے ہیں سب مل جُل کر
جمع ہو جاتے ہیں جب جلتی ہوئی آگ کے پاس
گھر سے باہر جو نکلتے ہیں تو سورج کے لیے
سردیِ جسم بڑھا دیتی ہے کچھ دھوپ کی پیاس
زیبِ تن اطلس و پشمینہ و سنجاب و سمور
اب جو چلتی ہیں چلیں سرد ہوائیں ہر سو
کھڑکیاں بند ہیں اور لپٹی ہوئی ہے تن سے
بھینی بھینی کسی دوشیزہ بدن کی خوشبو

لوٗ بہاروں کے یہ دن تجھ کو کریں آسودہ
رنگِ عارض سے ترے حسن کی ہو گل پوشی
خوش کرے عشق کی گستاخ نگاہی تجھ کو
تجھ کو سرشار کرے لذتِ ہم آغوشی
نیشکر رس کی لطافت سے دہن کو بھر دے
لبِ شیریں میں ہو چاول کے نوالوں کی مٹھاس
تیری ہستی سے رہے دُور بہت دردِ فراق
تیری قسمت میں نہ ہو ہجر کی راتوں کا ہراس

(۶)

آخرش موسمِ گل، وہ بروسنت آ ہی گیا
اپنے ہاتھوں میں لیے عشق کی رنگین کمان
کالے بھونروں کی قطاروں کی لچکتی ڈوری
آم کے بوَر کے تیر آتے ہیں یا پریم کے بان
چھیدتے ہیں یہ مرے دل کو، ترے سینے کو
ہم تو اے چندرودن عشق کے متوالے ہیں
ہم نے کب عشق کے دیوتا سے کیا ہے انکار
ہم نے کیا شوق کے پیغام کبھی ٹالے ہیں

جوشِ گُل یہ ہے کہ شاخوں کی جھکی ہے گردن
اور ہوا چلتی ہے مہکی ہوئی اترائی ہوئی
جھیلیں ہیں سُرخ کٹوروں سے کنول کے روشن
عورتیں عشق کی کرنوں سے ہیں گدرائی ہوئی
دن سبک، نرم، رواں، شام حسین و شاداب
دل کے لے لینے کا انداز انھیں آتا ہے
جو بھی اِس فصل میں بالیدہ و روئیدہ ہے
بوئے گُل، رنگِ بہاراں میں بدل جاتا ہے

بیلا پھولا ہے کہ جلتے ہیں خیاباں میں چراغ
نور کا کنج نظر آتا ہے مدھ بن جیسے
جس طرح عشق میں ہنستی ہے حسینہ کوئی
جگمگا اُٹھتے ہیں رُخساروں کے گلشن جیسے
زاہدِ خشک کی بھی خیر نہیں ہے کہ رواں
ہر طرف حسن کی اور عشق کی تنویریں ہیں
نوجواں سینوں میں جذبات ہیں یا آویزاں
وصل کے خوابوں کی ہنستی ہوئی تصویریں ہیں

فصلِ گل آئی ہے یا فصلِ وصال آئی ہے
ایک معشوقۂ خورشید جمال آئی ہے

کتنے دل کش ہیں مرے ملک کے موسم، اِن میں
حسن کی بات کریں عشق پر اصرار کریں
نورِ محبوب سے روشن کریں آنکھوں کے چراغ
پھول کی طرح سے ذکرِ لب و رُخسار کریں
مصحفِ حق کی طرح کھولیں کتابِ دل کو
جس میں جنگ اور جدل کا کوئی افسانہ نہیں
فصلِ گل، فصلِ خزاں، فصلِ زمستاں ہی مگر
موسمِ جنگ نہیں، موسمِ ویرانہ نہیں

۱۲ اکتوبر ۱۹۶۵ء

حرفِ آخر

مرگِ مجنوں پہ عقل گُم ہے میرؔ
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

یہ کتاب آخر اکتوبر ۱۹۶۵ء میں تیار تھی اور میری خواہش تھی کہ وسط نومبر تک شائع ہو جائے۔ لیکن کسی وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تاخیر اِس حرفِ آخر کے لیے ہوئی تھی جس کے بغیر شاید یہ کتاب نامکمّل رہ جاتی۔

جب میں نے ۲ر جنوری ۱۹۶۶ء کو شام کے سات بجے شاستری جی کو اپنی نظم "کون دشمن ہے" دوسری بار سُنائی تو مجھے یہ گمان بھی نہ تھا کہ یہ اُن کی زندگی کی آخری نظم ہو گی۔ اُس وقت میرے دل سے تاشقند ملاقات کی کامیابی کے لیے دُعائیں نکل رہی تھیں اور ۱۰ر جنوری کی رات کو امید و بیم کی بہت سی منزلوں سے گزرنے کے بعد میں نے دِلّی کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ معاہدۂ تاشقند کا جشن منایا۔ لیکن ۱۱ر جنوری کی صبح یہ معلوم ہوا کہ پردہ گرنے سے پہلے اِس المیے کا آخری سین باقی تھا جس نے پاک ہند جنگ کی شکل اختیار کی تھی اور معاہدۂ تاشقند پر ختم ہو رہا تھا۔ شاستری جی نے جان دے کر اس معاہدے پر اپنے خون کی مہر لگا دی ہے۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

تاشقند کی شام

مناؤ جشنِ محبّت، کہ خوں کی بُو نہ رہی
برس کے کھُل گئے، بارُود کے سیہ بادل
بجُھی بجُھی سی ہے جنگوں کی آخری بجلی
مہک رہی ہے گلُابوں سے تاشقند کی شام

جگاؤ گیسوئے جاناں کی عنبریں راتیں
جلاؤ ساعدِ سیمیں کی شمعِ کافوری
طویل بوسوں کے گُل رنگ جام چھلکاؤ

یہ سرخ جام ہے خوبانِ تاشقند کے نام
یہ سبز جام ہے لاہور کے حسینوں کا

سفید جام ہے دِلّی کے دلبروں کے لیے
گھلا ہے جس میں محبّت کے آفتاب کا رنگ

کھلی ہوئی ہے اُفق پر شفق تبسُّم کی
نسیمِ شوق چلی مہرباں تکلُّم کی
لبوں کی شعلہ فشانی ہے شبنم افشانی
اسی میں صبحِ تمنّا نہا کے نکھرے گی

کسی کی زلف نہ اب شامِ غم میں بکھرے گی
جوان خوف کی وادی سے اب نہ گزریں گے
جیالے موت کے ساحل پہ اب نہ اُتریں گے
بھری نہ جائے گی اب خاک و خوں سے مانگ کبھی
ملے گی ماں کو نہ مرگِ پسر کی "خوش خبری"
کوئی نہ دے گا یتیموں کو اب "مبارک باد"

کھلیں گے پھول بہت سرحدِ تمنّا پر
خبر نہ ہوگی یہ نرگس ہے کس کی آنکھوں کی

یہ گُل ہے کس کی جبیں، کس کا لب ہے، یہ لالہ
یہ شاخ کس کے جواں بازوؤں کی انگڑائی

بس اتنا ہوگا، یہ دھرتی ہے شہ سواروں کی
جہانِ حُسن کے گمنام تاجداروں کی
یہ سرزمیں ہے محبّت کے خواستگاروں کی
جو گل پہ مرتے تھے شبنم سے پیار کرتے تھے

خدا کرے کہ یہ شبنم یونہی برستی رہے
زمیں ہمیشہ لہو کے لیے ترستی رہے

نئی دلّی

۱۰ر جنوری سنہ ۶۶ء

اُسے نہ ڈھونڈھو

اِسے نہ ڈھونڈھو

اُسے نہ ڈھونڈھو کہ وہ کہیں بھی نہیں ملے گا
ابھی یہاں تھا، ابھی وہاں ہے
وہاں جہاں سے کبھی کسی کی
خبر ملی ہے نہ مل سکے گی

وہ ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھا، ایک تازہ ہوا کا جھونکا
جو زیست کے گلشنِ تمنّا
کو رنگ و بوئے بہار دے کر
گزر گیا ہے
مجھی نہ کہنا، وہ مر گیا ہے

نئی دلّی

۱۱ جنوری ۶۶ء

امانتِ غم

وہ جب تلک تھا اُفق پر، ہمیں خیال نہ تھا
کہ روشنی کی کرن بھی ہے اس اندھیرے میں
یہ نفرتوں کا اندھیرا جو دل کا دُشمن ہے

ہزاروں لاکھوں ستارے طلوع ہوتے ہیں
سیاہ رات کے سینے پہ تیرنے کے لیے
اور اس کے بعد وہ سیلابِ صبح میں جاکر
جو ڈوبتے ہیں تو ان کا پتہ نہیں چلتا
مگر یہ ننھّا ستارہ، یہ نور کا نُقطہ
جو دل فگار بھی تھا اور بے قرار بھی تھا
غروب ہو کے جو چمکا تو آفتاب بنا

غریب و عاجز و مسکین و بے زر و نادار
وہ انکسار میں ڈوبا خلوص کا پیکر
جسے ملی تھی شرافت دُکھے ہوئے دل کی
نہ جاہ و حشمتِ حاکم نہ دولتِ دُنیا
عطا ہوا تھا اُسے صرف مفلسی کا غرور
وہ ایک اشک کا قطرہ تھا، اس کا سرمایہ
بس ایک دردِ محبّت، بس ایک دولتِ غم

اور اس کا آخری تحفہ امانتِ غم ہے
یہ بار اُٹھے گا اسی عجز و انکسار کے ساتھ

امانتِ غمِ انساں، امانتِ غمِ دل
یہ اِک چراغ ہے قندیلِ مہر و مہ کی طرح
جو یہ نہ ہو تو زمانے میں روشنی کیوں ہو

یہ ایک پھول ہے جو زخم کے گلستاں میں

کھِلا، نہایا، شہیدوں کے خوں کی بارش میں
نہایا خواہشِ امن و اماں کی شبنم میں

یہ تاشقند کے سینے کا سرخ پھول بھی ہے
اسی کو کہتے ہیں لاہور کی جبیں کا گلاب
مہک رہا ہے جو دِلّی کے اب گریباں میں

اٹھو کہ جشنِ دل و جاں منایا جائے گا
ہر اک چمن میں یہی گُل کھلایا جائے گا
یہ گُل جو دردِ محبّت، امانتِ غم ہے
یہ گُل جو شوخ بھی، خوں گشتہ بھی، ملول بھی ہے
خدائے عشق بھی ہے، امن کا رسول بھی ہے

نئی دِلّی

۱۲ر جنوری ۶۶ء

کم ظرفیِ گفتار ہے دشنام طرازی
تہذیب تو شائستگیِ دیدۂ تر ہے